وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (الانعام آیت ۱۵۳)	اور دیکھو یہ میرا بالکل سیدھا راستہ ہے اسی پر چلو دوسرے طرح طرح کے راستوں کے پیچھے نہ پڑو وہ تمہیں سیدھے راستے سے ہٹا دیں گے۔

ان ٹیڑھے ترچھے راستوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط کھینچ کر سمجھایا ہے۔

خط لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطا بیدہ ثم قال ھذا سبیل اللہ مستقیماً ثم خط خطوطا عن یمین ذلک الخط وعن شمالہ ثم قال وھذہ السُبل لیس منھا سبیل الا علیہ شیطان یدعوا الیہ ثم قرأ ھذا الایۃ (نسائی واحمد)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے لمبا خط کھینچا اور فرمایا کہ یوں سمجھو کہ یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے اس کے بعد اس خط کے دائیں بائیں دونوں طرف بہت سے خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ طرح طرح کے راستے ہیں اور ان میں ہر راستہ پر ایک شیطان ہے جو اس کی طرف بلاتا ہے پھر آپ نے اوپر والی آیت پڑھی۔

زندگی کے ہر مسئلہ اور کاروبار و مشغلہ میں کامیابی کا مدار صراطِ مستقیم ہی پر ہے اور جب ناکامی و محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو کہیں نہ کہیں اس راستہ سے ہٹنا پایا جاتا ہے اس لیے صراطِ مستقیم کو عام رکھا گیا اور ہر موقع پر اس کی دعا کرتے رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ جن پر نہ آپکا غضب ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

پہلے صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) کی پہچان بتائی گئی ہے، اسمیں ضمناً صراطِ غیر مستقیم (ٹیڑھا ترچھا راستہ) کی پہچان ہے انداز وہی اختیار کیا گیا ہے کہ اس کا عملی نمونہ سامنے آجاتا ہے۔

یہ راستہ ان لوگوں کا ہے جو غضب میں آچکے ہیں اور جو گمراہ ہوئے ہیں، ان کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیڑھا ترچھا راستہ (صراطِ غیر مستقیم) دنیا و آخرت میں ناکامی و نامرادی اور سزا کا مستحق ٹھہراتا ہے کہ اس میں محبوب (اللہ) کی نافرمانی ہے جو بجائے خود بڑی محرومی ہے پھر اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ مزید برآں ہے مثلاً اللہ کی ناراضگی، خطرہ و خلجان کی زندگی اور بالآخر ناراضگی کی دوزخ میں داخل ہونا۔

اسی طرح قومی و جماعتی پیمانہ پر یہ نافرمانی پائی جاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں ذلت و خواری تباہی و بربادی خوف و خطر کی زندگی اور حکومت و اقتدار سے دست برداری بھی آجاتے ہیں۔

جو اللہ کے غضب میں آچکے ہیں اور جن کے تاریخی واقعات اللہ کی ناراضگی کا پتہ دیتے ہیں ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ۔ (آئدہ آیت ۶۰)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا۔

یہ آیت ان یہود کے بارے میں ہے جو خواہشات کے غلام بن کر رہ گئے تھے اور زندگی کی وہ روشنی بجھ چکی تھی جو انسانیت کو زندہ رکھتی ہے۔

جو گمراہ ہوئے ہیں اور جن کی گمراہی کے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۔ (مائدہ آیت ۷۷)

ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ ہوئے اور بہت سوں کو گمراہ کیا اور جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

یہ آیت ان نصاریٰ کے بارے میں ہے جو خواہشات میں پڑ کر صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے تھے اور بہت سی بدعتیں ایجاد کر کے ان پر عمل کرتے تھے۔

یہ دونوں آیتیں یہود و نصاریٰ کے احوال میں ذکر کی گئی ہیں اور ان دونوں میں بالترتیب غضب اور ضلال کے الفاظ ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغضوب علیہم سے مراد یہود اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔

ان آیتوں کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں بھی ہے کہ ان سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ (ترمذی و احمد)

لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ صراطِ غیر مستقیم (ٹیڑھے ترچھے راستے) پر چلنے والے یہی دو مذہبی گروہ ہیں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں، اسی طرح یہ بھی ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کی مذکورہ حالت ہمیشہ قائم رہے گی اس میں کبھی تبدیلی نہ ہوگی۔

آیت کا مقصود دراصل ان افکار (اعتقادات) و اعمال (کردار) کی نشان دہی ہے جو ان دونوں گروہوں میں پائے جاتے تھے اور جن کے باعث یہ غضب الٰہی کے مستحق ہوئے تھے اور گم کردہ راہ قرار پائے تھے۔

نزول قرآن کے زمانہ میں چونکہ ان قوموں میں یہ افکار و اعمال پائے جاتے تھے اور ان کے نتائج و انجام سے بھی یہ قومیں دوچار ہو رہی تھیں اس بنا پر مثال کے طور پر ان کو پیش کیا گیا اگر ان کی جگہ کسی اور قوم کو ان کی جیسی نمائندہ حیثیت حاصل ہوتی تو اس کو بطور مثال پیش کر دیا جاتا، مقصود وہ افکار و اعمال ہیں جو ان میں

پائے جاتے تھے وہ نتائج و انجام ہیں جن سے یہ دوچار تھیں مقصود یہ تو ہیں نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ یہ اپنی بری حالت سے نکل کر دوسری حالت میں آجائیں اور دوسری اپنی اچھی حالت سے نکل کر ان کی حالت میں آجائیں لیکن یہ نکلنا افکار و اعمال کی بنا پر ہی ہوگا کسی خصوصیت یا کسی سند و سرٹیفکیٹ کی بنا پر نہ ہوگا۔

گمراہ یہود و نصاریٰ دونوں تھے لیکن دونوں کی گمراہی کی نوعیت میں فرق تھا یہود کی گمراہی میں خبث نفس اور شرارت کو زیادہ دخل تھا، جبکہ نصاریٰ کی گمراہی میں کج فہمی و غفلت کو زیادہ دخل تھا اس کا اثر دونوں کے کردار میں نمایاں تھا، یہود کا کردار زندگی کی صداقتوں اور دینی حقیقتوں میں تفریط کا تھا یعنی کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت کر کے ان کی اصل صورت بگاڑ دیتے تھے اور جس کی جو حیثیت ہے اس کو کم کر کے اپنی جگہ سے ہٹا دیتے تھے۔

نصاریٰ کا کردار زندگی کی صداقتوں اور دینی حقیقتوں میں افراط کا تھا یعنی ان میں غلو اور مبالغہ سے کام لیتے تھے اور اصل کی جگہ بہت سی بدعتوں پر عمل کرتے تھے۔

قرآن میں جن نصاریٰ کا ذکر ہے اور یہود کی نسبت سے جن کے لیے نرم گوشہ پایا جاتا ہے وہ وہ ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کے خلیفہ راشد حضرت شمعونؑ (پیٹر) کے پیروکار تھے ان میں بعض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے قرآن کی یہ آیت ان ہی کے بارے میں ہے۔

لتجدن اشد الناس عداوۃ	تم اہل ایمان کے ساتھ دشمنی میں سب سے
للذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا	زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے
ولتجدن اقربھم مودۃ للذین	اور اہل ایمان کی دوستی سے زیادہ قریب
اٰمنوا الذین قالوا انا نصٰرٰی	ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ
(مائدہ ۸۲)	ہیں۔

اور جس فرقہ نے پولس (پال) کی پیروی کی ان کے افکار و اعمال اور حالات زیادہ خراب تھے وہ خود کو "مسیحی" کہلانا پسند کرتے تھے، نصاریٰ کہلانے میں اپنی توہین سمجھتے تھے، موجودہ عیسائی اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ (مفردات القرآن۔ فراہی)

یہودی و نصاریٰ کے جس قدر افکار و اعمال اور ان کے نتائج و انجام بیان ہوئے ہیں وہ سب احوال اور واقعات کے ذیل میں ہیں الگ سے کوئی باب یا فصل نہیں ہے، یہ انداز بیان نہایت مؤثر و دلکش ہے اس سے جو اثر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور سے نہیں پیدا ہوتی۔ مثلاً ایک شکل تو یہ ہے کہ سادے لفظوں میں سچائی کو ظاہر کر دیا جائے یعنی صرف اس کہنے پر اکتفا کیا جائے کہ سچ سچ ہے اور اس کا نتیجہ فلاح و کامیابی

ہے۔ جھوٹ جھوٹ ہے اور اس کا نتیجہ خسارہ و ناکامی ہے، دوسری شکل یہ ہے کہ سچائی کو عملی شکل (پریکٹیکل) میں دکھایا جائے کہ دیکھو! یہ قوم سچ بولتی تھی اس کو اس طرح فلاح و کامیابی نصیب ہوئی اور یہ قوم جھوٹ بولتی تھی اس کو اس طرح خسارہ و ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ اثر کی جو کیفیت دوسری شکل سے پیدا ہوتی ہے وہ پہلی شکل سے نہیں پیدا ہو سکتی۔

اس اندازِ بیان سے انسان کے افکار و اعمال کی خاصیتیں اور زندگی میں ان کے اثرات کھل کر سامنے آجاتے ہیں جس طرح غذاؤں اور دواؤں کی خاصیتیں ہیں اور استعمال کرنے سے ان کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح افکار و اعمال کی بھی خاصیتیں ہوتی ہیں جن کے کرنے و نہ کرنے سے ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ اثرات کبھی جلدی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی ان کے ظاہر ہونے میں دیر لگتی ہے۔ اس دیر لگنے سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے اور وہ افکار و اعمال کے خواص و ان کے اثرات سے ہی انکار کر دیتے ہیں حالاں کہ دیر لگنے کے دوسرے اسباب اور دوسرے اعمال ہوتے ہیں جو انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں جس طرح فائدہ مند چیزوں کے استعمال سے فائدہ میں دیر لگتی ہے یا نقصان دہ چیزوں کے استعمال سے فوراً نقصان نہیں پہونچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ ان چیزوں نے اپنی اپنی خاصیتیں بدل دی ہیں اور اثرات میں تبدیلی آگئی ہے بلکہ اس کے اسباب دوسری چیزوں کے اثرات میں تلاش کرنا چاہیئے جن کو وہ استعمال کرتا ہے یا پہلے استعمال کر چکا ہے اور جسم میں ان کے اثرات اب تک موجود ہیں۔ اسی طرح افکار و اعمال کے خواص و اثرات کو بھی سمجھنا چاہیئے، ہماری نظر صرف ایک پہلو کو دیکھتی ہے جبکہ خواص و اثرات کو سمجھنے کے لیے تمام پہلوؤں پر نظر کی ضرورت ہے۔

اس اندازِ بیان سے قانون و اخلاق، تاریخ و سیاست اور فطرت و مذہب سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان سب کو زندگی کے ساتھ جوڑنے والی ایک ایسی طاقت (اللہ) ہے جو حاکم ہی نہیں بلکہ محبوب بھی ہے جو صرف عظمت و جلال کا مظاہرہ نہیں کرتی بلکہ سرور و نشاط کا خزانہ بھی لٹاتی ہے اور جس سے واقفیت کے بعد یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں رہتی کہ اس کے بغیر زندگی میں ایک ایسا خلا رہتا ہے جو کسی اور سے پُر نہیں ہو سکتا اور جس کے بغیر سماج میں ایسے جراثیم پیوست ہو جاتے ہیں جو اس کے دشمن ثابت ہوتے ہیں یہ بحث جس قدر نفیس و شاندار ہے اسی قدر علمی اور تفصیل طلب ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے (جاری ہے)

سوئے (حدیث پاک) اور اجتماعی طور پر پورا محلہ یا بستی کے لوگ اس امر کے قانونی طور پر ذمہ دار ہیں کہ ان کی حدود میں کوئی شخص ایسا نہ ہو جس کی معاشی احتیاجات پوری نہ ہوں۔ اور اگر ان کے اس فریضہ کی عدم ادائیگی کی وجہ سے کوئی شخص کسی بستی میں بھوکا (یا بے علاج) مرجائے تو اس کی دیت بستی والوں پر واجب ہے۔ موجودہ دور میں لوکل باڈیز کو قانونی طور پر یہ ذمہ داری دی جانی چاہیئے۔ فی الحال تو ان کی ذمہ داری صرف لاوارث لاشوں کو فٹ پاتھوں سے اٹھانا ہے، زندہ لاوارث لوگوں (یعنی ایسے لوگ جن کے خاندان والے، رشتہ دار، قریبی ہمسائے ان کی کفالت کا فریضہ ادا کرنے میں ناکام رہیں) کی ذمہ داری بھی انہی لوکل باڈیز کے سپرد کی جانی چاہیئے۔ اگر فنڈز کا مسئلہ ہو تو صوبائی یا مرکزی حکومت یا زکوٰۃ کونسل اپنے اپنے وسائل سے ان لوکل باڈیز کی اس خاص ضمن میں مدد کر سکتے ہیں۔

چوتھا دائرہ ریاست۔ ایسے مستحقین جن کی مذکورہ بالا تینوں سطحوں پر کفالت نہ ہو رہی ہو۔ بدرجۂ آخر ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کی کفالت کا انتظام کرے جیسا کہ ارشاد عالی ہے۔ اَنَا وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَہٗ اسی طرح ایسے افراد کی فوتیدگی کی صورت میں ان کے معاشی واجبات (مثلاً قرض وغیرہ) کی ذمہ داری بھی ریاست کی ہے جب کہ یہ ذمہ داری ان کے اہل خاندان، رشتہ دار، ہمسائے اور بستی والے پورا کرنے سے کوتاہی کریں۔ یہاں پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ صنعتی دور میں، سماجی اکھاڑ پچھاڑ، خاندانی نظام کے انتشار اور ترکِ سکونت کے روز افزوں رجحانات اور URBANISATION (دیہات سے شہروں کو نقل مکانی) کی وجہ سے ایسے افراد کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو صحیح معنوں میں کس مپرس ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا اور نتیجۃً ریاست کی کفالت کا دائرہ اب وسیع سے وسیع ہوتا جا رہا ہے دوسرے الفاظ میں، دورِ جدید کی ریاست کی ذمہ داریاں کفالت کے سلسلہ میں اب زیادہ سے زیادہ ہوتی جا رہی ہیں۔ اس رجحان کی کچھ اور وجوہ بھی ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے بہر حال ایسے کس مپرس، بے آسرا، اور غیر مکفول لوگوں کی کفالت کے انتظام سے کوئی اسلامی ریاست اگر کوتاہی کرے گی تو فی الواقع وہ اپنا ایک شرعی فریضہ پورا کرنے سے کوتاہی کر کے ان لوگوں کو غیر اسلامی معاشی نظاموں کے لیے ایک بنا بنایا چارہ یا FOODER کے طور پر مہیا کرنے کے ناقابلِ معافی جرم کی مرتکب ہوگی۔

(۳) اہلیتِ کسب وسعیِ کسب کے لیے مساواتِ مواقع

اگرچہ اسلام مساواتِ مطلق کا قائل نہیں ہے کہ فطرت میں اس قسم کے مظہر (PHENOMENON) کا کوئی وجود سرے سے ہے ہی نہیں۔ لیکن اسلام میں اخوت کا تصور بہر حال ہے اور جیسا کہ ہر اچھے گھرانے میں

ہوتا ہے اسلامی معاشرہ کے خاندان میں بھی اس امر کی لازماً کوشش کی جانی چاہیئے کہ ابتداءً ہر فرد کو کسب کا اہل بننے کے لیے ایک جیسے مواقع مہیا کیے جائیں (اس اصول کا تقاضا تعلیم میں مساواتِ مواقع ہے اور ایک ہی ملک وملت میں مختلف قسم کے نظام ہائے کی تعلیم کی نفی ہے) نیز کسب کے لیے ہر فرد کے لیے میدان ایک جیسا کھلا ہو اور اس میں حلال وحرام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جہاں تک کوئی بڑھنا چاہے بڑھ سکے (اس اصول کا تقاضا اجارہ داریوں (MONOPOLIES) کی نفی ہے)

کسب کے لیے اہل بنانا اور کسب کے لیے مواقع اور JOBS کی بہم رسانی اور ان تک کھلی رسائی اسلام کے اس منشاء کے بھی عین مطابق ہے جس کا ذکر بالا ہوا۔ اس سلسلہ میں وہ واقعہ بالخصوص قابلِ ذکر ہے جس میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیت المال سے کچھ دینے کی بجائے ان کے اپنے اثاثہ (کمبل) کو خود نیلام فرما کر اس کے لیے کلہاڑی اپنے دست مبارک سے تیار فرمائی اور اس طرح سے انہیں کسبِ حلال کے اہل بنا کر انہیں عیالاً علی المسلمین اور بیت المال پر بوجھ بننے سے روکا ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد کو کسب کے اہل بننے اور پھر کسب کرنے کے لیے مساواتِ مواقع EQUALITY OF OPPORTUNITY مہیا کرنے کا انتظام کر دیا جائے تو پھر کفالتِ عمومی کے اداروں پر، اس نسبت سے بوجھ کم سے کم تر ہو جائے گا۔ اور وہ نوبت آجائے گی کہ صدقہ دینے والا تو ہوگا، لیکن صدقہ لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ (جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ مبارک میں ہوا!

معاشی عمل کے ہر مرحلہ کے لیے حلال وحرام کی حدود

اسلام میں معاشی فعالیت (ECONOMIC ACTIVITY) ایک ایسا کھیل نہیں جس کے کوئی قواعد یا RULES نہیں ہیں اور جس میں ہر کھلاڑی جس طرح سے چاہیے بغیر کسی سزا کے فاؤل (FOUL) کر سکتا ہے نہ ہی یہ ایک ایسا کھیل ہے جس کے میدان کی کوئی باؤنڈری لائن نہ ہو، کوئی حد بندی نہ ہو۔ اسلام میں کسب کے مرحلہ پر، پھر صَرف (CONSUMPTION) کے مرحلہ پر اور پھر بچت شدہ مال (SAVING) کے استعمال کے سلسلہ میں چند واضح اور کھلی کھلی ہدایات ہیں جو یہ طے کرتی ہیں کہ کمائی کی حدود کون کون سی ہیں۔ اور کس قسم کی کمائی ہے جسے چھونے کا ایک مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا، پھر اس کمائی کو خرچ کرنے کے سلسلہ میں کون کون سی حدود ہیں جن کو توڑنا مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ اور آخر میں بچت شدہ رقوم کے سلسلہ میں کچھ واضح ارشادات ہیں بالخصوص اکتناز کی حُرمت، سُود کی حرمت، اور سال گذرنے پر ۲½ فیصد زکوٰۃ۔ گویا معاشی کارکردگی میں مادر پدر آزادی نہیں ہے اور مذکورہ بالا تینوں مرحلوں (کسب صَرف اور بچت) میں سے ہر ایک

ہیں اسلام دخل دیتا ہے اور بتایا ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام۔ مغربی سرمایہ داری اور اسلام میں ایک بنیادی فرق یہی حلال و حرام کا ہے۔ سرمایہ داری میں کسی مرحلہ پر کوئی پابندی نہیں ہوتی سرمایہ دارانہ معاشرہ دراصل انسانی معاشرہ ہوتا ہی نہیں ہے یہ ایک جنگل ہے جہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول (یا بے اُصولی) کارواج ہوتا ہے اور معاشی طور پر زیادہ طاقت ور افراد کو اس بات کی کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ سماجی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے روپے کے زور پر جیسے چاہیں کھیل کھیلیں.... اس کے برعکس... اسلامی معاشرہ ایک انسانی معاشرہ ہوتا ہے، ایک بھائی چارے کا معاشرہ ہوتا ہے، ایک خاندان ہوتا ہے جس میں اپنی اپنی اہلیت، صلاحیت، ذوق اور کارکردگی کی بنا پر معاشی تفاوت تو ہوتا ہے مگر یہ تفاوت اس بات کا جواز نہیں ہوتا کہ معاشرہ کے معاشی وسائل کو غیر سماجی انداز میں بڑھایا جائے (مثلاً احتکار کے ذریعہ یا سُود کے ذریعہ) یا غیر سماجی انداز میں صرف کیا جائے (مثلاً اسراف و تبذیر صرفِ نمائشی۔ محل اور مقبرے وغیرہ۔)

ایک ایسی ریاست جس میں ذاتی ملکیت کی تو اجازت ہو مگر حلال و حرام کی پابندیاں سختی سے نافذ نہ کی جائیں صریحاً غیر اسلامی اور سرمایہ دارانہ ریاست ہے۔ اسلامی ریاست کا ایک ذمہ یہ اُس سخت گیر اور منصف ریفری (REFREE) کا ہے جو جب بھی کسی کو کھیل میں فاؤل (FOUL) کرتے دیکھتا ہے (اس سیاق و سباق میں جب بھی کوئی فرد، ادارہ کسب، صرف، یا بچت کے مرحلہ پر حرام مشاغل میں ملوث ہوتا ہے) تو ایسے کھلاڑی کو کان سے پکڑ کر کھیل کے میدان سے باہر نکال دیتا ہے اگر کوئی ریاست ایسا نہیں کرتی تو اسے بہر حال اسلامی ریاست کہلانے کا کوئی حق نہیں اور ایسی ریاست محض سرمایہ داری کے گندے کھیل کو جاری رکھنے کی ایک بے جواز اور غیر اسلامی اور انجام کار ناکام کوشش ہوتی ہے اور موجودہ حالات میں یہ ایک ایسی کشتی ہے جو آج ڈوبی کہ کل ڈوبی، اور اپنے ساتھ پتہ نہیں کس کس کو لے ڈوبے (علاوہ امتِ اسلامیہ کے اسلام کے نام نیک کو بھی)

(۵) ارتکازِ زر کی حوصلہ فرسائی

جیسا کہ سورۃ حشر کی آیت نمبر سات میں مذکور ہے اسلام ارتکازِ زر کے سخت خلاف ہے اور وہ تمام پالیسیاں جن سے امیر، امیر تر اور غریب سے غریب تر ہوتے جائیں، اُن کے غیر اسلامی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ ایک نہایت ہی بنیادی اصُول ہے اور اس سے اسلامی معاشرہ میں دولت کے بہاؤ کا رُخ متعین ہوتا ہے اسلامی معاشرہ میں اصُول یہ ہے کہ تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ وَتُرَدُّ اِلٰى فُقَرَآئِهِمْ ریاست کا کام یہ ہے کہ وہ دولت مال داروں سے لے اور محتاجوں کو واپس کرے (یہاں

پر "تُرَدُّ" کا لفظ قابلِ غور ہے اور اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ استحصال کا تصور اور اس کی تلافی کے لیے اقدامات تجویز کرنا اور ان پر عمل کرنا کوئی ایسی بات نہیں ہے جو دورِ جدید کے مفکرین کی اجارہ داری ہے) اگر کسی معاشرہ میں بالغرض یوں ہوتا ہے کہ دولت غریبوں سے لے کر دولت مندوں کے مفاد میں صرف کی جائے تو اس معاشرہ کے غیر اسلامی ہونے میں کوئی احمق یا جاہل یا بدنیت شخص ہی شبہ کر سکتا ہے۔ دولت کے بہاؤ کے اس غیر اسلامی رخ کی ایک مثال وہ پبلک سکول ہیں جنہیں سرکاری خزانہ سے امداد ملتی ہے لیکن عملی طور پر وہاں امراء کے بچے ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ اسلامی اصولوں کی دوہری خلاف ورزی ہے (دوسرا اصول جس کی خلاف ورزی ہوتی ہے وہ تعلیم میں مساواتِ مواقع کا اصول ہے جس کا ذکر نمبر۳ بالا میں کیا گیا)

(۶) مال کے ضیاع کی نہی

عام تصور کے خلاف اسلام میں مال و دولت کی بڑی اہمیت ہے اور اسے زندگی کے قیام کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مال و دولت کی پیداوار بڑھانے کی ترغیب دی گئی ہے (نمبر۱ بالا ملاحظہ ہو) اور ساتھ ہی ساتھ اسے ضائع کرنے سے منع فرمایا گیا ہے اور اس ضیاع کو روکنے کے لیے اسراف و تبذیر اور صرفِ نمائشی (مثلاً بلا ضرورت تعمیر جیسا کہ قومِ عاد[1] کے سلسلہ میں ذکر ہوا نیز پختہ قبریں اور مقبرے، مردوں کے لیے سونا چاندی اور ریشم، سونے چاندی کے برتن، یہ صرف چند مثالیں ہیں اور ان سے ملتا جلتا صرف ہر عہد اور ہر زمانہ میں حرام قرار دیا گیا ہے)

دراصل اسلام مال کی سماجی نوعیت کا قائل ہے[2] اور کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کہے کہ پیغمبر کون ہوتا ہے ؟ کہ ہمیں اپنے مال میں من مانی کرنے سے روکے (اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا)

یہاں پر ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ حرام خوری اور مال کے ضیاع یا اسراف میں ایک گہرا تعلق ہے جیسا کہ کہا گیا ہے ع مالِ حرام بود، بجائے حرام رفت اگر حلال و حرام کی حدبندیوں کو توڑنے کی اجازت نہ دی جائے تو اسراف و تبذیر بڑی حد تک ختم ہو جائیں۔

مال کے ضیاع کو روکنے کے لیے اسلام کو جو اصرار ہے اس کا ایک پہلو یہ ہدایت بھی ہے کہ احمق لوگ جن سے یہ خطرہ ہو کہ وہ مال کا مناسب انتظام کرنے کے نااہل ہوں تو ان کی اپنی ملکیت کا مال بھی ان کے زیرِ تصرف نہ دیا جائے[3] (وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ) یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ مال کی ملکیت ان

---

[1] (سورۂ شعراء۔ آیت نمبر۱۲۸) [2] (سورۂ ھود۔ آیت نمبر۸۷)
[3] (سورۂ نساء۔ آیت نمبر۵)

سفہاء کی ہے لیکن آیت مبارکہ میں اموالکم کی ترکیب استعمال کی گئی ہے اموالہم کی ترکیب نہیں۔ اور یہ بات اس امر کی دلالت کرتی ہے کہ اگرچہ اس ملکیت کا ایک پہلو ذاتی ہے لیکن اس کا ایک سماجی اور اجتماعی پہلو کو زیادہ اہم سمجھتے ہوئے قرآن نے اموالکم فرمایا، اموالہم نہیں فرمایا۔ اس سے فقہا نے یہ استخراج کیا ہے کہ اگر کوئی صاحبِ مال اپنے مال کے انتظام اور صرف میں سفاہت کا مظاہرہ کرے تو امام کو (ریاست کو) یہ حق ہے کہ اُس کے حقوقِ ملکیت وقتی طور پر معطل کر دے۔

(۷) مادی، مالی اور انسانی وسائلِ پیداوار میں رفعِ تعطل

اسلام اس بات کا انتظام کرتا ہے کہ معاشی وسائل معطل نہ پڑے رہیں مثلاً ایسا نہ ہو کہ ایسی زمین جس میں کاشت ہو سکتی ہے بغیر کاشت کے پڑی رہے۔ اگر کوئی ایسا شخص جس کے قبضہ میں زمین ہو اور وہ مسلسل تین سال تک اس سے کاشت نہ کرے تو امام کو (ریاست کو) یہ حق ہے کہ وہ اپنی سطح پر اس زمین کے تعطل کے رفع کرنے کا انتظام کرے یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہ تین سال کی مدت یا اس حکم کے ضمن میں صرف زمین کا ذکر ہوا۔ دراصل اس خاص اصول کے ایک اطلاق کا ذکر ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں یہ مدت شوریٰ سے کم و بیش کی جا سکتی ہے اور اس حکم کا اطلاق پیداوار کے دیگر سرچشموں مثلاً کارخانوں وغیرہ پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ اشیائے صرف مثلاً غلہ، کپڑا وغیرہ کو معطل رکھا جائے یا ان کا احتکار کیا جائے یا سرمائے کا احتکار کیا جائے۔ اس مظہر کو اسلام میں اکتناز کی اصطلاح سے یاد کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں شاید سب سے زیادہ ناپسندیدہ امر انسانی وسائل پیداوار کا تعطل ہے یعنی لوگ کام کرنے پر راضی اور تیار ہوں لیکن انہیں کام نہ ملے اور روزگار یا JOBS نہ مہیا کی جائیں۔ یا یہ کہ لوگوں کو پیداواری عمل میں شرکت کے لیے کسی خاص زمانہ میں جن تکنیکی اہلیتوں (Technical Skills) کی ضرورت ہے انہیں اس کی تربیت کے مواقع مہیا نہ کیے جائیں اور وہ غیر پیداواری یا نیم پیداواری زندگیاں گذارنے پر مجبور ہوں اس طرح سے وہ خود اپنے لیے ایک عذاب اور ملک و ملت کے لیے ایک بوجھ ثابت ہوں۔ نالائقی کی انتہا یہ ہے کہ جو چیز اثاثہ (Asset) بن سکتا ہو اسے ذمہ داری یا بوجھ (Liability) بنا لیا جائے۔

(۸) العفو کا انفاق

العفو کا ذکر جب کیا جاتا ہے تو عام طور پر وہ نقطۂ نظر ملحوظ ہوتا ہے جس کو روائتی طور پر حضرت ابوذر